طارق محمود ہاشمی *

اردو زبان : روایات اور لسانی استعماریت

Abstract:

The Urdu Language: Tradition and Linguistic Imperialism

This article discusses the socio-imperialistic aspect and origin of words as they come to be used in a language. Language is influenced by the attitudes and behaviour of the dominant class of a society. As the West has prevailed over the East over the past some centuries, it seems do have established itself in the minds of the subjugated races as superior in colour, manners, etc., so that white and red is all good whereas black has come to be connected with all that is vile and vicious. The me then in compound of black always denotes a negative meaning whereas white symbolises purity as red does happiness, joy and exuberance. The article traces in the Urdu language such words that have acquired a negative or a positive meaning through the trend that took root through an imperialistic mind-set and influence.

Keywords: The Urdu Language, Linguistic Imperialism,

زبان ذریعۂ اظہار ہے لیکن یہ جذبات و خیالات کے ساتھ ساتھ اپنے بولنے والوں کی عمرانی صورتِ حال اور ذہنی ساخت کو بھی ظاہر کر رہی ہوتی ہے۔ کسی زبان میں استعمال ہونے والے الفاظ، تراکیب، محاورات وضرب الامثال آئینہ ہوتے

ہیں بولنے والوں کے طرزِ فکر، معیارِ ذہنی اور نفسیاتی اثرات کا جو اُن عمرانی حقائق کی صورت میں مرتب ہوتے ہیں، جن کا انھوں نے سامنا کیا ہوتا ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ ان حقائق کے بارے میں ادراک بھی رکھتے ہوں۔ بعض حقائق کا صدیوں پہلے رونما ہونے والے واقعات سے تعلق ہوتا ہے اور اُن کے اثرات کئی ایک نسلوں کے لاشعور میں سرایت کیے ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعض اثرات اُن استعماری طاقتوں کے باعث بھی مرتب ہوتے ہیں جو محکوموں کے وسائل کے ساتھ ساتھ ان کی زبان پر بھی کئی ایک جہتوں سے اپنا تسلط جماتے ہوئے دیگر سماجی روایات کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کے اثرات بھی منتقل کرتے ہیں۔

اُردو زبان کی تشکیل میں زرعی دور کے طبقہ اشرافیہ کی اقدار اور نوآبادیاتی فضا دونوں کے اثرات ہیں۔ لہٰذا اس کی لسانی ساخت میں ان کی تہذیبی اقدار کا عکس واضح ہے۔ گذشتہ چند دہائیوں سے عالمی سطح پر انسانی صورتِ حال میں بہت بڑے پیمانے پر تبدیلی رونما ہوئی ہے اور بہت سے تصورات جو صدیوں سے رائج چلے آرہے ہیں اور ان کی اخلاقی جہت پر کوئی سوال نہیں اٹھایا گیا تھا، اب ان پر بحث بھی ہو رہی ہے اور انھیں مختلف زاویوں سے دیکھا بھی جا رہا ہے۔

اس سلسلے میں لسانی بشریات (lingusitic anthropology) اور بعد ازاں عمرانی لسانیات (sociolinguistics) کے ماہرین نے نہایت اہم نوع کی تحقیقات کر کے اپنے نتائج مرتب کیے ہیں جس میں یہ دیکھا گیا کہ کس طرح مختلف سماجی معیارات، طبقاتی امتیازات، صنفی تقاضے اور ماحول نیز عہد کے تقاضے زبان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے بیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان اور جاپان میں بعض بنیادی تحقیقات ہوئیں۔ تھامس کالن ہڈسن (Thomas Callan Hodson) (۱۸۷۱ء–۱۹۵۳ء) نے ۱۹۳۹ء میں ''ہندوستان میں عمرانی لسانیات'' (''Sociolinguistics in India'') کے عنوان سے بہت اہم مضمون رقم کیا۔ عمرانی لسانیات پر مغرب میں باقاعدہ کام ساٹھ کی دہائی میں ہوا۔ امریکی ماہر لسانیات ولیم لیبو (William Labov) (پ:۱۹۲۷ء) اور برطانوی ماہرین ولیم سٹیورٹ (William Stewart) (۱۹۰۸ء – ۲۰۰۲ء) اور ہینز کلوس (Heinz Kloss) (۱۹۰۴ء – ۱۹۸۷ء) کی اس ضمن میں تحقیقات بہت اہم ہیں۔

اردو زبان میں لسانیات کی طرف اس نوع کی توجہ کم ہی کی گئی ہے اور معاشرتی اثرات کے تناظر میں زبان کے بارے میں کوئی اہم تحقیقات سامنے نہیں آسکیں۔ اردو کے قواعد زبان، تاریخ اور اس نوعیت کی دیگر تحقیقات کے نتائج سے یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ اس زبان کی ساخت پر اس کے بولنے والے مختلف طبقات یا اس کے بولنے والوں پر استعماری عناصر کس

طرح اثر انداز ہوئے اور آج کے ذخیرۂ الفاظ میں وہ اثرات کس طرح سرایت کیے ہوئے ہیں۔

اُردو زبان میں بعض الفاظ تو ایسے ہیں جو روزمرہ اور رسمی گفتگو میں عام طور پر بولے اور لکھے جاتے ہیں لیکن اس کا احساس تک نہیں کیا جاتا کہ ان الفاظ کا سماجی ماخذ کیا ہے اور استعمال کرنے والے ماضی کی استعماری سماجیات سے تاحال ذہنی طور پر کتنے مرعوب ہیں۔ مثلاً درج ذیل جملے ملاحظہ ہوں:

ہم آپ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

یہ آپ کا طرۂ امتیاز ہے۔

یہ کام آپ ہی کی بدولت ہوا۔

یہ سادہ سے جملے روزمرہ گفتگو میں سنائی دیتے ہیں لیکن ان کے بعض الفاظ کو عمرانی تناظر میں دیکھیں تو ان کا تعلق ملوکیت اور اشرافیہ کی اقدار سے واضح ہے۔ خراج وہ رسم ہے جو عہد ملوکیت میں رائج تھی۔ شہنشاہوں اور نوآبادیاتی حکمرانوں کو غلام اقوام یا زیرِ تسلط علاقوں کے نمائندے دربار میں جا کر پیش کرتے تھے۔ چنانچہ آج بھی کسی کے لیے تعریفی کلمات بھی ادا کرنے ہوں تو دربار کی اُسی رسم سے استفادہ کیا جاتا ہے جس سے بادشاہ کی عظمت کا اعتراف کیا جاتا تھا۔

اسی طرح طرہ پگڑی کا وہ حصہ جس کی بلندی سے صاحبانِ جاگیر اپنے مقام و مرتبے کا اظہار کرتے ہیں۔ اَب کسی کی کوئی امتیازی صفت کا بیان کرنا ہو تو طرہ ہی پیمانہ قرار پاتا ہے۔

لغات میں لفظ بدولت کا معنی اگرچہ باعث، وسیلہ یا سبب درج ہے لیکن اس کا لغوی مطلب ''دولت سے'' ہے۔ ویسے تو بغیر دولت کے کوئی کام بھی نہیں ہوتا لیکن طبقاتی سماج میں بہت سے مشکل کام بلکہ ایک عام آدمی کو بظاہر ناممکن نظر آنے والے کام زردار طبقات دولت سے نہایت سہولت سے کر لیتے ہیں۔ ان کے لیے مشکل کشائی کا ایک بڑا سبب یا وسیلہ دولت ہوتی ہے۔ لہٰذا جب کوئی کسی کی بڑی مشکل کو حل کرنے کا وسیلہ بنتا ہے تو لفظ بدولت استعمال کیا جاتا ہے۔

عربی کہاوت ''كلام الملوك، ملوك الكلام '' یا انگریزی اصطلاح ''linguistic imperialism'' کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ جو کچھ بادشاہ کلام کرتا ہے یا اعلیٰ طبقہ جن الفاظ کا چناؤ کرتا ہے وہ معاشرتی لغت میں ایک اہم مقام حاصل کر لیتے ہیں اور جس طرح رسوم و روایات کی تشکیل ایک خاص استعماری طبقے یا معتبر افراد کے ذریعے ہوتی ہے اور سماج کے عام افراد اُن کی پیروی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، اس طرح یہ الفاظ بھی ہماری روزمرہ لغت کا اس طرح حصہ بنتے ہیں کہ انھیں خارج نہیں کیا جا سکتا۔

زبانوں کی تاریخ دیکھی جائے تو لسانی استعمار کے باعث کئی ایک بوالعجبیاں سامنے آتی ہیں۔ ہندوستان پر ایک

عرصہ اہلِ عجم نے حکومت کی لہٰذا اُردو کی لسانی ساخت پر فارسی نے ایک خاص اثر ڈالا لیکن اگر خود فارسی کو دیکھا جائے تو اس زبان پر بھی لسانی استعمار کے بعض نہایت حیران کن اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ترکوں کے سیاسی عروج کے زمانے میں سرزمینِ فارس کے باشندے اُن کے لیے محنت و مشقت کرتے تھے لیکن اُن کی کوئی سیاسی حیثیت نہیں تھی نہ ہی وہ سماجی لحاظ سے معتبر تھے لہٰذا یہ تاجک یعنی اجنبی کہلاتے تھے اور یہ لفظ انھوں نے سماجی طور پر ایسا قبول کیا کہ باوجود بعد میں اپنی سیاسی ترقی اور عروج کے یہ لفظ آج بھی اُن کے ہاں مستعمل ہے۔

کچھ ایسی ہی صورتِ حال اُردو کی ہے۔ عام اور روزمرہ زندگی سے وابستہ الفاظ کو دیکھیں تو وہ ہندی الاصل ہیں لیکن وہ الفاظ جن سے سماجی برتری کا اظہار کرنا ہو، وہ سب کے سب عربی و فارسی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً دولت و ثروت، تزک و احتشام، سطوت و عزت، وجاہت، امیر، اطاعت، مال و متاع، آرام و آسائش، جاہ و جلال وغیرہ۔ اسی طرح وہ الفاظ جو مقتدر طبقات کی تہذیب سے تعلق رکھتے تھے وہ آج بھی ہماری تمدنی زندگی کا حصہ ہیں۔ مثلاً، قالین، تکیہ، نان، کباب، پلاؤ، قورمہ، کلاہ، دستار اور قمیص وغیرہ۔

ان حقائق کی روشنی میں احمد دین کی یہ بات نہایت اہم ہے کہ ملکوں کے افراد کی تاریخ کا پتا اُن کی زبان کی گواہی سے بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ایک معمولی کتاب لغت کی مدد سے ہم کسی ملک کی گذشتہ تاریخ میں اُس کے باشندوں کی موجودہ زبانِ شہادت پر (تحقیق) کر سکتے ہیں۔ آپ کو خوب معلوم ہے کہ علم طبقات الارض کا ماہر کس طرح مختلف طبقات اوّلین، دوئم اور سوئم، یکے بعد دیگرے نظر آنے والوں سے کسی حصۂ ملک کے متواتر طبعی تغیرات کا پتا لگا سکتا ہے اور اُسے یہ موقع حاصل ہوتا ہے گویا ان تغیرات کا وہ اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر رہا ہے اور ان کے پیدا کرنے میں جو طاقتیں کام کرتی تھیں، انھیں (سے) وہ اندازہ کر سکتا ہے اور قریب قریب اُن کی تاریخ بھی بتا سکتا ہے۔[۱]

مقتدر طبقات اور طاقتیں نظم ونسق کے لیے محض عملی اقدامات نہیں کرتیں بلکہ بعض ذہنی اور نفسیاتی اقدامات بھی کرتی ہیں اور ایک ایسی عمرانی فضا تشکیل دی جاتی ہے کہ محکوم افراد خدمات بھی انجام دیتے ہیں اور اس حقیقت کو بھی اپنے اذہان و قلوب میں بٹھا لیتے ہیں کہ ہمارے حکمران ہمارے لیے وسیلۂ نجات و رحمت ہیں۔ انھیں حقِ حکمرانی ہے اور وہ ہمارے لیے ''ظلِ سبحانی'' یعنی سایۂ خداوندی ہیں۔

اردو پر لسانی استعماریت کے نشانات، الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال میں کئی ایک حوالوں سے تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ الفاظ کی سطح پر دیکھیں تو اردو میں ایک لفظ ''خاندانی'' ہے جو ایک کلمۂ تحسین کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو لغات

میں اس کا مطلب ''شریف گھرانے کا فرد، اعلیٰ خاندان والا'' ہے۔ یہ لفظ ترکی الاصل ہے۔ ابتدا میں یہ لفظ کسی طبقے، شعبے یا جگہ کی صفت کے طور پر استعمال ہوتا تھا جیسے خاندانی نواب، خاندانی گلوکار، خاندانی حویلی یا خاندانی گرجا لیکن بعد میں مقتدر طبقات نے اسے بہ طور خاص اپنی نسلی برتری کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

دلچسپ امر ہے کہ اردو میں نسلی برتری کے لیے لفظ خاندانی کا پہلی بار استعمال نوآبادیاتی دور میں مولانا الطاف حسین حالی نے کیا۔ ''مسدس حالی'' کا درج ذیل بند ملاحظہ ہو:

بگاڑے ہیں گردش نے جو خاندانی
نہیں جانتے بس کہ روٹی کمانی
دلوں میں ہے یہ یک قلم سب نے ٹھانی
کہ کچے بسر مانگ کر زندگانی
جہاں قدر دانوں کا ہیں کھوج پاتے
پہنچتے ہیں واں مانگتے اور کھاتے[۲]

اس لفظ کا عمرانی پہلو اس طرزِ فکر کو واضح کر رہا ہے کہ یہ مخصوص طبقات کی نفسیاتی بالادستی کے لیے استعمال ہوا اور آج بھی اس نفسیاتی برتری کے لیے مستعمل ہے۔ دلچسپ امر ہے کہ طبقاتی فکر کا یہ اثر محض انسانوں تک محدود نہیں بلکہ اردو میں اس لفظ کا استعمال حیوانات کے لیے بھی کیا جاتا ہے۔ مثلاً فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں:

واجد علی شاہ بادشاہ تھے۔ اُن کو خاندانی مرغیوں کا بڑا شوق تھا۔[۳]

ایک نوع کے حیوانات اپنی جسامت کے لحاظ سے چھوٹے، بڑے یا رنگت کے لحاظ سے برے یا بھلے معلوم ہو سکتے ہیں لیکن وہ کسی اعلیٰ یا ادنیٰ خاندان کے ہیں۔ یہ محض وہ تصور ہے جو انسانی طبقات سے پروان چڑھنے والے نفسیاتی احساسِ برتری سے پھوٹا ہے۔

لفظ خاندانی کی طرح ''اصل'' یا ''اصیل'' کے الفاظ بھی خاندانی بالادستی ہی کے اظہار کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اردو لغات میں اصل کا معنی ''خاندانی، پشتینی، نسل شریف جس کا نسب بے میل اور بے داغ ہو'' درج ہے جب کہ اصیل کا معنی ''خاندانی شریف اور اچھے نسب والا'' ہے۔ دلچسپ امر ہے کہ لفظ خاندانی کی طرح لفظ ''اصل'' بھی بطور اسمِ صفت استعمال ہوتا تھا لیکن بعد ازاں مقتدر طبقات نے اپنے لیے اسے اپنی منفرد حیثیت دے کر خود کو اصل و اصیل ثابت کر دیا۔ یہ پہلو بہت مضحکہ خیز ہے کہ مفرد حیثیت میں یہ لفظ صرف جانوروں خصوصاً مرغی، گھوڑے یا اونٹ کے لیے مستعمل تھا۔ لیکن مقتدر طبقات کو

صفات مستعار لینی ہوں تو وہ کسی سے بھی ''ہتھیا'' لیتے ہیں۔

اصل کا لفظ نہ صرف مقتدر طبقات نے اپنے لیے استعمال کیا بلکہ اس کے ساتھ ''کم'' یا ''بد'' کے سابقے لگا کر دوسروں کو نیچا بھی ثابت کرنا شروع کر دیا۔ وارث سرہندی نے ایک کہاوت نقل کی ہے:

> اصل سے خطا نہیں، کم اصل سے وفا نہیں۔ خاندانی آدمی بدی نہیں کرتا اور کمینہ وفاداری نہیں کرتا۔[۴]

درج ذیل جملہ ملاحظہ ہو، جس میں یہی تصور کارفرما ہے:

> اُس نے کسی رذیل، کم اصل، کمینے اور پست ہمت شخص کو کوئی عہدہ نہیں دیا۔[۵]

خود کو اصل ثابت کرنے کے لیے ایک اور لفظ ''نجیب الطرفین'' بھی مستعمل ہے۔ یعنی وہ شخص جو ماں باپ دونوں کی طرف سے اصل نسل سے ہو اور خاندانی طور پر ددھیال اور ننھیال شریف ہو۔ شبلی نعمانی *المامون* میں ہارون الرشید کے بچوں مامون اور امین کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس امتحان میں اُس کا دوسرا بیٹا امین بھی شریک تھا جو مامون سے ایک برس چھوٹا تھا اور جس کو اس بات میں شرف حاصل تھا کہ اُس کی ماں زبیدہ خاتون تھی اور اس اعتبار سے وہ نجیب الطرفین تھا۔[۶]

''کم اصل'' اور ''بداصل'' کی طرح اردو میں ''کم اوقات'' اور ''بداوقات'' کے الفاظ بھی مستعمل ہیں۔ اوقات عربی لفظ ہے جو وقت کی جمع ہے۔ اردو میں یہ لفظ واحد اور مؤنث بھی استعمال ہوا ہے لیکن ایک خاص مفہوم میں۔ ابتداً یہ حالت کے معنی دیتا تھا لیکن بعدازاں حیثیت کے مفہوم میں بھی مستعمل ہوا۔ عمرانی لحاظ سے دیکھا جائے تو ''اوقات'' کے مذکورہ استعمال کے پیچھے بھی استعماری اور طبقاتی سماج کی تشکیل دی جانے والی نفسیات ہے کہ اس نوع کے ماحول میں حیثیت کا تعین افراد کے اوقات کار سے بھی ہوتا ہے۔ غریب اور معمولی ملازمت پر متعین افراد کے اوقاتِ کار زیادہ ہوتے ہیں۔ جب کہ بعض لوگ ایک سے زیادہ ملازمتیں کرنے پر بھی مجبور ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس اعلیٰ عہدوں پر متعین افراد کے لیے اوقاتِ کار محض دستاویزی حد تک ہوتے ہیں اور وہ خوشحال بھی ہوتے ہیں۔ مزید دیکھیں تو صاحبانِ جائداد و جاگیر تو آبائی ورثے ہی کی ''بدولت'' فارغ البالی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اس تناظر میں وہ لوگ کم اوقات یا بد اوقات قرار پائے جن کے اوقاتِ کار بہت زیادہ ہیں۔

اردو زبان کے عمرانی حقائق میں یہ امر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی لسانی نشوونما میں اشرافیہ طبقے کے تشکیل دیے گئے اس ماحول کا بھی اثر ہے جس میں ذات پات کا امتیاز بہت اہم رہا ہے اور تاحال کسی نہ کسی صورت میں موجود بھی

ہے اور مؤثر بھی۔ اردو میں لفظ ''ذات'' کا استعمال بھی مقتدر طبقات نے اپنی سماجی برتری کے لیے خوب خوب کیا۔ ''اصل'' اور ''اوقات'' کی طرح اس کے ساتھ بھی ''کم'' اور ''بد'' کے سابقے لگا کر معاشرتی طور پر کمزور افراد طبقات کو اس کی حیثیت کا آئینہ دکھایا گیا۔ اس سلسلے میں لغات میں درج ذیل محاورے اور مفاہیم قابلِ ذکر ہیں:

i۔ ذات پر جانا۔ جب کسی کمینے سے کوئی برا فعل سرزد ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ وہ ذات پر گیا ہے یعنی کمینہ ہونے کے سبب سے اُس سے یہ فعل سرزد ہوا۔

ii۔ ذات میں دھبا لگانا / ذات میں بٹا لگانا۔ نسل میں عیب لگنا۔[۷]

اس طرح درج ذیل کہاوتیں ملاحظہ ہوں:

ذات کی بیٹی ذات ہی میں جاتی ہے۔ شریف کی شادی شریف کے ساتھ ہوتی ہے۔ شادی بیاہ، برادری میں ہوتا ہے۔[۸]

ڈوم بجائے چینی اور ذات بتائے اپنی۔ آدمی کی اصلیت اُس کے قول اور فعل سے ظاہر ہوتی ہے۔[۹]

یہاں چند ایسی کہاوتیں بھی توجہ کے قابل ہیں جو باوجود اشرافیہ کی اقدار کے تسلط اور مقتدر سماجی طبقات کے اثر و رسوخ کے محنت کش افراد کی صلاحیت و استعداد کو تسلیم کرنے کی خو کو ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً:

ذات بھانت نہ پوچھے کوئی، کرتی اپنی تلنگیا ہوئے۔ جو شخص محنت کرتا ہے وہی مقبول ہوتا ہے۔ نام ونسب کی کوئی اہمیت نہیں۔[۱۰]

استعماری طاقتوں اور اشرافیہ کی اقدار کے باعث ذات پات کی تعریف کے مذکورہ تصورات اگرچہ صنعتی ترقی کے دور میں دم توڑنے لگے ہیں لیکن زمینی حقائق کو دیکھا جائے تو ان کے اثرات تاحال قائم ہیں۔ یونس اگاسکر نے درست لکھا ہے کہ:

ذات پات، رنگ ونسل اور پیشوں کے اعتبار سے اونچ نیچ کے تصورات نے ہزاروں سال سے اپنے قدم جما رکھے ہیں جنھیں اکھاڑنا اب تک ممکن نہیں ہو سکا ہے البتہ تیز رفتار ترقی اور بڑھتی ہوئی شہری آبادی نے ان تصورات کی جڑوں کو ہلا ضرور دیا ہے۔ مگر دیہی سماج اور زرعی معیشت اب تک ان پر مبنی عقائد کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ کہاوتیں چونکہ روایات کی امین ہوتی ہیں اس لیے ان میں اونچ نیچ کے روایتی تصورات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔[۱۱]

فارسی زبان کے اردو پر اثرات واضح ہیں اور اہل اردو نے جہاں اس کے بعض قواعد زبان کی پیروی کی ہے وہاں لسانی استعمار کا رسوخ بھی قبول کیا ہے۔ فارسی میں جب کسی شے کی بڑائی ظاہر کرنی ہو یا اُسے اپنے ہم جنس عناصر سے ممتاز

کرتے ہوئے اُس کی توصیف بیان کرنی ہوتو اس کے ساتھ ''شاہ'' کا سابقہ لگایا جاتا ہے۔ مثلاً: شاہ باز، شاہ پارا، شاہ کار، شاہ رگ، شاہ راہ، شاہ سوار، شاہ خانم، شاہ مات، شاہ نامہ وغیرہ۔

''شاہ'' کے سابقے کا استعمال دراصل ملوکیت کے ماحول اور اشرافیہ کی اقدار سے نفسیاتی مرعوبیت ہی کو ظاہر کرتا ہے۔ ماضی میں بادشاہ کا وجود سب سے برتر اور اعلیٰ خیال کیا جاتا تھا اور اس کی دیگر انسانوں کے دلوں پر دھاک ہوتی تھی لہٰذا دیگر موجودات کی ماہیت کے تعین اور تقابل و تجزیے میں بھی اس نفسیاتی اثر کی کارفرمائی ظاہر ہوئی۔

شاہ کے لفظ سے ہماری مذہبی دانش نے بھی نہایت عجیب وغریب پیراؤں میں اثرات قبول کیے ہیں اور وہ مقدس ہستیاں جن کی تمام تر جدوجہد ملوکیت اور استعماریت کے خاتمے کے لیے تھی، اُن کے ساتھ ایک بار پھر اس لفظ کی نسبت ظاہر کر کے نفسیاتی سطح پر ذہنوں میں ملوکیت کی اقدار کے لیے اکرام و احترام کا جذبہ پیدا کر دیا گیا۔ اس نکتے کی بہت تفصیل میں نہ بھی جایا جائے تو ملوکیت کی اقدار سے ہماری مذہبی دانش کی دلچسپی کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ معاصر خانقاہی ماحول میں خانقاہ کے لیے ''دربار'' اور صاحب درگاہ کے لیے ''شاہ'' ہی کے لفظ مستعمل ہیں۔

اردو زبان کے بعض الفاظ نے جو فارسی الاصل ہی ہیں، فارسی کے جولسانی استعماری اثرات قبول کیے ہیں، ان کے باعث بعض ایسے الفاظ بھی مستعمل ہوئے جو اپنے اندر رنگ کی بنیاد پر نسلی امتیاز کے گہرے اثرات رکھتے ہیں۔

مشرقی معاشرے میں جب کوئی کامیاب ہوتا ہے یا اُسے عزت نصیب ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ ''وہ سرخ رو ہوا'' ۔ اس کے برعکس جب کوئی ناکام ہوتا ہے یا کسی سبب سے اُسے ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اُسے ''سیاہ رو'' یا ''رو سیاہ'' کہا جاتا ہے۔ سادہ لفظوں میں یوں بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ اُس نے منہ کالا کیا یا اُس کا منہ کالا ہوا یعنی عزت دار یا کامیاب شخص سرخ چہرے والا اور ناکام و رسوا کالے چہرے والا۔

رنگت کی یہ تقسیم، استعماریت کے زیرِاثر نسلی امتیاز سے واضح ہے۔ تاریخ میں جن نسلوں نے فتوحات حاصل کیں اور دنیا بھر پہ حکومتیں قائم کیں وہ نسلی لحاظ سے سرخ و سفید تھیں جب کہ غلام اقوام کے لوگ کالے تھے۔ وہ نہ صرف محکوم ہوئے بلکہ ان محکوموں سے اتنی نفرت کی گئی کہ وہ ذلت و رسوائی کا نشان بن گئے۔

معاصر تہذیبی ماحول میں کالے رنگ کے لوگ اگرچہ نسلی بنیادوں پر ماضی ایسی نفرت کا ہدف تو شاید نہ ہوں لیکن اُس تحیر کا اثر کسی نہ کسی طور قائم ہے۔ سبطِ حسن نے ماضی کے مزار میں لکھا ہے:

> قومیں فنا ہو جاتی ہیں مگر نئی نسلوں کے طرزِ معاشرت پر، صنعت وحرفت پر، سوچ کے انداز پر اور ادب وفن کے کردار پر ان کا اثر باقی رہتا ہے۔ زبانیں مردہ ہو جاتی ہیں لیکن اُن کے الفاظ اور محاورے، علامات اور

استعارات نئی زبانوں میں داخل ہو کر اُن کا جز بن جاتے ہیں۔ پرانے عقائد کی خدائی ختم ہو جاتی ہے لیکن نئے مذہب کی ہر آستین میں اور عمامہ و دستار کے ہر پیچ میں پرانے بہت پوشیدہ رہ جاتے ہیں۔[۱۲]

فی زمانہ اگرچہ تمیز بندہ و آقا کی وہ صورت حال یا ویسی نوعیت تو نہیں رہی لیکن استعماری طاقتوں کے تشکیل کردہ تصورات کے بابت بنی نوع انسان کے لاشعور میں نسلی افتراق کی بنیاد پہ اور رنگوں کی بنیاد پہ قائم شدہ امتیازات راسخ ہو گئے۔

فارسی زبان میں کالے رنگ سے نفرت کے استعماری اور طبقاتی اثرات کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہر وہ سماجی عنصر جس سے منفیت وابستہ کرنی ہو، اس کے ساتھ سیہ کا سابقہ یا لاحقہ لگا دیا جاتا ہے۔ مثلاً:

سیاہ باطن — بدباطن، منافق، مکار
سیاہ بخت — بدنصیب
سیاہ دل — بے مروت، بے وفا
سیاہ رو — رسوا، بدنام
سیاہ روزگار — بدنصیب، مفلس
سیاہ زبان — جس کی بددعا جلد اثر کرے
سیاہ کار — بدکار، فاسق، گنہ گار
سیاہ مست — نشے میں چور

فارسی کے زیر اثر اردو میں بھی نسلی امتیاز کے مذکورہ تصورات کو لسانی سطح پر اسی طرح قبول کر لیا گیا اور برصغیر کے باشندے اگرچہ خود بھی نسلی لحاظ سے سرخ و سفید نہیں لیکن انھوں نے بیرونی آقاؤں کے لسانی تصورات کو لاشعوری طور پر تسلیم کر لیا۔ اردو زبان میں ''کالے رنگ'' کی صفت وہی مفہوم رکھتی ہے جو فارسی زبان میں ''سیہ'' سے وابستہ ہے۔ مثلاً:

کالا دھن — حرام کی کمائی
کالا قانون — برا یا ظالمانہ قانون
کالا منہ — کلمۂ نفرت
کالے کرتوت — غلط کام / حرام کاری
کالا دھندا — ناجائز اور غیر قانونی کام
کالا منہ کرنا — غلط کاری
کالا منہ ہونا — ذلیل و رسوا ہونا
کالی زبان — وہ زبان جس کی بددعا جلد اثر کرے

کالا منہ، نیلے ہاتھ پاؤں — ذلیل وخوار

یہ ایک عجیب امر ہے کہ غلام افراد کے کالے ہونے کی وجہ سے سزا یافتہ لوگوں کو مزید ذلیل و رسوا کرنے کے لیے اُن کی شبیہ بھی اُن جیسی بنائی جاتی۔ مثلاً کہاوت ''کالا منہ، نیلے ہاتھ پاؤں'' کا معنی لکھتے ہوئے نور اللغات کے مؤلف نے لکھا ہے کہ:

> ہندوستان میں دستور تھا کہ جب حاکم کسی سے ناراض ہو جاتا تھا تو اس کا منہ کالا، ہاتھ پاؤں نیلے کر کے گدھے پر چڑھا کر تشہیر کیا کرتا اور پھر شہر سے نکلوا دیتا۔ جس سے نہایت رسوائی اور بدنامی ہوتی تھی۔ اس وجہ سے متنفر کی حالت میں یہ کلمہ بولنے لگے۔[۱۳]

کالی رنگت سے محض نفرت و حقارت کا تصور ہی وابستہ نہیں رہا بلکہ اشرافیہ طبقات میں نحوست، بیوست اور بدبختی کی علامت خیال کیا گیا۔ اب یہ تصور مذکورہ طبقات کی لسانی استعماریت کے باعث ہماری عام سماجی ذہنیت اور معاشرتی نفسیات میں پختہ ہو چکا ہے۔ اردو میں ''سبز قدم' یا ''سبز قدمی'' کا تصور فی الاصل کالے رنگ سے وابستہ نحوست ہی کا تصور ہے۔ سبز رنگ سے اگرچہ ہریالی یا ہرے پن کا خیال آتا ہے لیکن اہلِ فارس کے ہاں سبز کا معنی سانولا یا کالا ہے۔ فرہنگِ آمرہ کے مؤلف نے سبز رنگ کا معنی ''سانولی رنگت، گندمی'' درج کیا ہے اور فرہنگِ آصفیہ کے مؤلف نے سبز قدم سے وابستہ بدبختی کے تصور کے ذیل میں یہ وضاحت بطورِ خاص کی ہے کہ:

> چوں کہ اہلِ فارس سبز بمعنی سیاہ اکثر استعمال کرتے ہیں اس وجہ سے یہ معنی ہو گئے۔[۱۴]

یہاں یہ امر بھی بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے کہ سبز پا اور سبز قدم کے الفاظ اردو میں فارسی ہی سے داخل ہوئے اور اس سے وابستہ تصور بھی اہلِ فارس ہی یہاں لائے۔ جیسا کہ لغت نامۂ دہ خدا کے مؤلف نے سبز پا کا معنی ''شوم قدم، نامبارک پا، بدقدم، مقابلِ سپید پا'' درج کیا ہے۔

کالے رنگ سے نفرت کا احساس محض مشرقی سماج میں نہیں بلکہ دنیا کے وہ تمام خطے جہاں سرخ و سفید نسلیں آباد ہیں اور انھوں نے سیہ فام لوگوں پر حکومت کی ہے یہ طرزِ احساس نہ صرف موجود ہے بلکہ پختہ تر ہے۔ اور ان خِطّوں کی زبانوں میں بھی یہ اثرات دیکھے جا سکتے ہیں جیسا کہ انگلش میں black کی صفت کم و بیش انھی معنوں میں استعمال ہوتی ہے جو فارسی اور اردو میں رائج ہے۔ اس سلسلے میں انگریزی زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں black list، black mail، black market، black money اور black sheep ایسے الفاظ قابلِ توجہ ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے قومی انگریزی لغت میں لفظ black کے جو معنی دیے ہیں، وہ انھی تصورات پر مبنی ہیں

جو اردو میں مستعمل ہیں۔ اس ذیل میں انھوں نے جو معنی رقم کیے ہیں، وہ یہ ہیں:

> بدشگون، کنجوس یا مجرمانہ، نہایت برا، قابلِ نفرت، غضب ناک، قہر آلود، یا غصے والا، ذلت کا، رسوائی کا یا مستوجب سزا (الزام وقصور کی علامت)۔[۱۵]

جس طرح لفظ ''black'' یا ''کالا'' برائی اور نفرت کی علامت ہے۔ فاتح اقوام اور سرخ نسلوں نے رنگ سرخ کو عزت اور وقار کے نشان کے طور پر استعمال کیا ہے۔ برطانیہ، امریکا اور ترکی کے جھنڈوں میں سرخ رنگ غالب ہے۔ حکومتی ایوانوں اور اعلیٰ اداروں کے قیام کے احاطے کو red zone قرار دیا جاتا ہے۔ کسی مہمان کا باوقار استقبال کرنا ہو تو اُس کے رستے میں سرخ قالین بچھایا جاتا ہے۔

صنعتی اور فوجی لحاظ سے طاقتور سرخ و سفید نسلیں قدرتی دولت سے مالا مال علاقوں میں رہنے والی کالی اقوام پر اپنی تہذیب اور طرزِ حیات کو مسلط کرنا کس طرح اپنا فرض سمجھتی ہیں، اس کا جواب رڈیارڈ کپلنگ (Rudyard Kipling) کی نظم ''White Man's Burden'' سے بخوبی ملتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ یورپ اور امریکا میں فی زمانہ نسلی امتیاز کے تصورات ختم ہو گئے ہیں بلکہ ان معاشروں میں آج بھی موجود ہیں۔ BBC نے اپنی ایک رپورٹ (۱۸ اگست ۲۰۱۶ء) میں ''The Equality and Human Rights Commission'' نامی تنظیم کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

> سفید فام نوجوانوں کے مقابلے میں سیاہ فام گریجویٹس کو اوسطاً ۲۳ فیصد کم اجرت ملتی ہے جب کہ نسلی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد بڑی تعداد میں بے روزگار ہیں۔ کمیشن کے چیئرمین ڈیوڈ آئزک کا کہنا ہے کہ یہ رپورٹ برطانیہ کے یورپی یونین سے الگ ہونے کے فیصلے کے بعد نفرت پر مبنی جرائم، منظّم طریقے سے ہونے والی دور رس بے انصافیوں اور نسلی امتیاز سے متعلق کئی باعث فکر پہلوؤں کا انکشاف کرتی ہے ...... اُن کا کہنا تھا کہ اگر جدید برطانیہ میں آپ سیاہ فام ہیں یا نسلی اقلیت، تو آپ اکثر محسوس کر سکتے ہیں کہ آپ کسی اور دنیا میں رہتے ہیں، کبھی آپ کو قومی معاشرے کا حصہ ہونے کا احساس نہیں ہو گا۔[۱۶]

اسی طرح امریکی پولیس نے ۲۰۰۵ء میں ''The Colour of Crime'' کے عنوان سے ایک رپورٹ پیش کی جس میں امریکی معاشرے میں پائے جانے والے اس غالب طرزِ احساس کو بیان کیا گیا کہ سیاہ فام باشندے، سفید فاموں کی نسبت زیادہ جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ تفصیلی رپورٹ کی ابتدا میں لکھا گیا ہے:

> Most Americans at least suspect that blacks and Hispanics are more likely to

commit crimes than whites or Asians.[۱۷]

ان سرخ و سفید اقوام نے نوآبادیاتی حکمران بن کر نہ صرف وسائل پر قبضہ کیا بلکہ اپنے محکوموں کے ذہنوں پر اپنے تصورات بھی مسلط کیے اور اپنی عیاری و مکاری سے جس طرح محکوم اقوام کو اپنے وسائل کے لوٹے جانے کا احساس نہیں ہونے دیا، اسی طرح اُن کے ذہنی میلانات اور تصورات پر بھی اپنے استعماری سائے بڑی ہوشیاری سے پھیلائے اور ان محکوم اقوام کے لسانی ڈھانچے میں اس نوع کے الفاظ کی ایک بڑی تعداد داخل ہو گئی جو خود ان کی تضحیک کے لیے استعمال کیے گئے لیکن نوآبادیاتی اشرافیے نے انھیں اس کثرت سے استعمال کیا کہ یہ محکوموں کی لسانی ثقافت کا حصہ بن گئے۔

نوآبادیاتی حکمرانوں کے اقتدار کی اب وہ صورت تو نہیں رہی لیکن محکوموں کے لاشعور میں اُن کے استعماری اثرات اس طرح سرایت کر چکے ہیں کہ اُن کی تشکیل کردہ لسانی ساخت سے ذہنی آزادی ممکن نہیں رہی۔ یہ حیران کن امر ہے کہ ان تصورات کو مذہبی اشرافیہ نے بھی تقویت دی ہے اور ذات پات کے امتیازات سے لے کر رنگ و نسل کے افتراق تک کو کسی نہ کسی طور پر مذہبی رنگ بھی عطا کر دیا گیا۔ اس مقصد کے لیے بعض مقامات پر سنجیدہ مذہبی تعلیمات کو پسِ پشت ڈالنے میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ خصوصاً کالے رنگ کو واضح مذہبی تقدس حاصل ہونے کے باوجود اس رنگ کی تضحیک کے لیے کئی ایک روایتیں نقل کی جاتی ہیں۔

اردو زبان محکوم اقوام کی زبانوں میں سے ہے اور اس کے لسانی ڈھانچے پر ملوکیت کے ماحول اور نوآبادیاتی آقاؤں کے استعماری تصورات کی پرچھائیاں واضح ہیں۔ ان میں سے بعض اثرات بہت واضح جب کہ بعض موہوم ہیں لیکن ان اثرات کی عمرانی سطح پر کھوج لگانے کی کوئی اہم یا سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی اور صنعتی ارتقا کے باعث نظامِ زندگی میں ایک بڑی تبدیلی کے باوجود لسانی سطح پر ملوکیت کا تسلط موجود ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عالمگیریت کی آقائیت ہمارے سماج پر کس نوع کے اثرات قائم کرتی ہے اور ان سماجی اثرات کے باعث اردو زبان کے لسانی ڈھانچے میں کیا تغیرات رونما ہوتے ہیں۔

حوالہ جات

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، فیصل آباد۔

۱۔ احمد دین، سرگزشت الفاظ (اسلام آباد: پورب اکیڈمی، ۲۰۰۸ء)، ۱۳۸۔

۲۔ الطاف حسین حالی، کلیاتِ نظم حالی، جلد دوم، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (لاہور: مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۰ء)، ۹۸۔

۳۔ فرحت اللہ بیگ، مضامین فرحت (حیدرآباد دکن: عہد آفریں برقی پریس، س ن)، ۲۹۶۔

۴۔ وارث سرہندی، جامع الامثال (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء)، ۳۲۔

۵۔ امجد علی شاکر، ''ثقافت اور اردو زبان''، صحیفہ (اپریل تا جون ۱۹۸۹ء): ۳۳۔

۶۔ شبلی نعمانی، المامون (اعظم گڑھ: دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی، ۱۹۹۲ء)، ۱۷۔

۷۔ نورالحسن نیر، نور اللغات (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۲ء)۔

۸۔ وارث سرہندی، جامع الامثال، ۲۲۲۔

۹۔ ایضاً، ۲۲۲۔

۱۰۔ ایضاً، ۲۲۳۔

۱۱۔ یونس اگاسکر، اردو کہاوتیں اور اُن کے سماجی و لسانی پہلو (لاہور: نشریات، ۲۰۱۱ء)، ۱۶۷۔

۱۲۔ سبط حسن، ماضی کے مزار (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۷ء)، ۵۔

۱۳۔ نورالحسن نیر، نور اللغات۔

۱۴۔ مولوی سید احمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ، جلد سوم (لاہور: الفیصل، ۲۰۱۶ء)۔

۱۵۔ جمیل جالبی، قومی انگریزی لغت (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸ء)۔

۱۶۔ http://www.bbc.com/urdu/world/2016/08/160818_britain_black_ethinic_minorities_inequality_sz

۱۷۔ ''The Colour of Crime''، دوسرا ایڈیشن (اوکٹن: نیو سینچری فاؤنڈیشن، ۲۰۰۵ء)، ۱۔

مآخذ

اگاسکر، یونس۔ اردو کہاوتیں اور اُن کے سماجی و لسانی پہلو۔ لاہور: نشریات، ۲۰۱۱ء۔

بیگ، فرحت اللہ۔ مضامین فرحت۔ حیدرآباد دکن: عہد آفریں برقی پریس، س ن۔

جالبی، جمیل۔ قومی انگریزی لغت۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸ء۔

حالی، الطاف حسین۔ کلیاتِ نظم حالی۔ جلد دوم۔ مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ لاہور: مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۰ء۔

حسن، سبط۔ ماضی کے مزار۔ کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۷ء۔

دہلوی، مولوی سید احمد۔ فرہنگِ آصفیہ۔ جلد سوم۔ لاہور: الفیصل، ۲۰۱۶ء۔

دین، احمد۔ سرگزشت الفاظ۔ اسلام آباد: پورب اکیڈمی، ۲۰۰۸ء۔

سرہندی، وارث۔ جامع الامثال۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء۔

شاکر، امجد علی۔ ''ثقافت اور اردو زبان''۔ صحیفہ (اپریل تا جون ۱۹۸۹ء): ۲۸–۴۰۔

نعمانی، شبلی۔ المامون۔ اعظم گڑھ: دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، ۱۹۹۲ء۔
نیر، نورالحسن ۔ نور اللغات۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۲ء۔

برقی ماخذ

http://www.bbc.com/urdu/world/2016/08/160818_britain_black_ethinic_minorities_inequality_sz

انگریزی ماخذ

''The Colour of Crime'' ۔ دوسرا ایڈیشن ۔ اوکٹن: نیو سینچری فاؤنڈیشن، ۲۰۰۵ء۔